شرعی سزاؤں کی تنفیذ میں حکومتی اور عدالتی اختیارات

(مشکلات اور تدارک)

عبدالغفار *

عبدالغفار **

قانون اسلام کا یہ اساسی امتیاز ہے کہ اس کے تمام اصول اور تمام فیصلے وحی الٰہی اور عقلی اجتہاد کے امتزاج پر مشتمل ہیں۔ اس کے مقابلے میں وضعی قوانین کی بنیاد محض انسانی فکر پر ہوتی ہے، جس میں انسانیت کے انفرادی یا اجتماعی کسی نہ کسی پہلو کے لحاظ سے ناواقفیت اور نااہلیت کا پہلو نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتہاد کو کبھی یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اسلام کے مسلمہ اصول وجزئیات سے انحراف کرسکے، مجتہد و مجدد بلکہ روئے زمین کے تمام مجتہدین مل کر بھی اللہ کی معین حدود وقیود سے تجاوز نہیں کر سکتے تو کسی حکمران کو اس طرح کی حیثیت حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ بالخصوص اس وقت جبکہ جدید سیکولر تہذیب کے دباؤ کے تحت کمزور حکمران اس طرح کا اقدام کریں تو ان کی فکری پستی اور اسلام شناسی کی حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ تحریف شدہ مذاہب، جدید سیکولر تہذیب اور اسلام کے مزاج کا فرق ایک مسلمان کے لئے سمجھنا بہت ضروری ہے۔

دین اسلام کے مطابق اسلامی ریاست کے حکمران، منتظمین اور قانون ساز اداروں کے پاس تھیاکریسی کی طرح اللہ اور مذہب کے نام پر اپنی اور غیر مسلموں کی خواہشات اپنی مسلم عوام پر مسلط کرنے کا اختیار نہیں ہوسکتا۔ یہ بات مساوات وعدل کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ حکمرانوں کے پاس ایسے اختیارات ہوں تو حاکم اور عوام کی برابری، قومی آزادی اور انسانی آزادی کا تصور بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اسلام کا وسیع تر تصور عبادت بھی یہ ہے جو کہ اللہ کی محض رسمی پوجا کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام کو انسانی عملی اور اجتماعی زندگی پر قائم کیا جاتا ہے۔ اسلام میں حدود وتعزیرات کا تصور بھی حکمرانوں کے لئے دین کی فرمانبرداری اور اجتہادی اختیارات کی حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ کیونکہ حدود میں ان کے لئے کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں ہوتی اور

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، پاکستان۔

** پی ایچ ڈی سکالر شعبہ عربی واسلامیات، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان، پاکستان۔

تعزیرات میں وہ اپنے صوابدیدی اختیارات اسلامی اصول فقہ کی روشنی میں رہ کر حاصل کرتے ہیں۔اسلام میں اگر حکمران کو حدود وقصاص میں تبدیلی لانے کا اختیار ہو تو حدود وتعزیرات کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔حدود وقصاص میں حذف واضافہ کا اختیار پیغمبر اسلام ﷺ کو بھی نہیں دیا گیا، بلکہ ان کی تنفیذ میں لیت ولعل اور نرمی برتنے سے منع کیا گیا ہے۔(۱)

فقہائے کرام نے حدود کو اللہ کا حق قرار دیا ہے۔ایک انسان اپنا حق دوسرے کو معاف کر سکتا ہے مگر اللہ کا حق معاف کرنے کا اختیار اس کے پاس نہیں ہے۔جس طرح عبادات اللہ کا حق ہیں اور کوئی مسلم حاکم اپنی عوام کو نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کی ادائیگی سے بریٔ الذمہ ہو جانے کا حکم نامہ جاری نہیں کر سکتا، یہی حال حدود وقصاص کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی تناظر میں فرمایا تھا کہ جو شخص زکوۃ کی ادائیگی میں معمولی سی تبدیلی کا بھی روادار ہوگا اسلامی حکومت اسے برداشت نہیں کرے گی۔ کیونکہ اسلامی حکومت کے قیام کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ اللہ کے احکام نافذ کرنے کے لئے معرض وجود میں آتی ہے۔مغربی نظام کا مطالعہ ہم پر یہ واضح کرتا ہے کہ ان کے نظام ان کے مقاصد کے تحت کچھ ایسے عوامل موجود ہوتے ہیں، جنہیں وہ کسی مصلحت کے تحت تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔اس لیے یہ بات عرف عام میں سنی جاتی ہے کہ مغرب میں حکمران تبدیل ہو جاتے ہیں مگر پالیسیاں نہیں بدلتیں۔اگر کوئی حکمران اپنی قومی اجتماعی پالیسی بدلنے کی کوشش کرے تو الیکشن یا تحریک اختلاف سے اس حکمران کو بدل دیا جاتا ہے۔

قاعدہ فقہیہ ہے کہ "لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان" اس کے تحت شرح مجلّہ میں علامہ محمد خالد اتاسی لکھتے ہیں کہ شریعت کے جو احکام عرف وعادت یا انسانی حالات کے تغیر پر مبنی ہوں ایسے شرعی احکام میں تبدیلی آتی ہے, اس کے علاوہ اسلام کا ہر حکم ہمیشہ قائم رہتا ہے۔(۲)اسی طرح ڈاکٹر احمد الحجی نے المدخل الفقھی میں لکھا ہے کہ شرعی احکام دو طرح کے ہیں : احکام تعبدی (یعنی غیر معقول المعنی) ایسے احکام کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔دوسرے احکام ہیں الاحکام المعَلَّلَه یہ احکام مزید دو طرح کے ہوتے ہیں بعض معلل احکام کی علت واضح اور ثابت ہوتی ہے۔ ایسے احکام میں بھی کبھی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ البتہ جو احکام عرف اور مصالح پر مبنی ہوتے ہیں وہ وقت کے ساتھ تبدیلی قبول کرتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ" وبذلک تکون القاعدۃ مااطلق وأرید به المقید" کہ یہ قاعدہ عمومی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ شرائط سے مقید ہے۔(۳) اس کے مقابلے میں یہ قاعدہ ہمارے موقف کا مؤید ہے"لا مساغ للاجتھاد فی مورد النص" (۴)، یہ قاعدہ بھی اہم ہے "التصرف علی الرعیۃ منوط بالمصلحۃ" (۵) ارشاد بارتعالیٰ ہے مَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ

سُلْطَانًا (۶) لہٰذا اگر ورثاء مقتول کا خون معاف نہ کریں تو عدالت، ریاست و حاکم معافی کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ریاستی ادارے دو طرح سے پابند ہیں، اللہ کے حق (نص قطعی کا حکم) کی وجہ سے اور عوامی حق کی وجہ سے بھی۔

سزاؤں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا فرق

حقوق العباد کے لحاظ سے دو پہلو ہیں مثلاً چوری سے بندہ کا حق سلب کیا گیا اور اس پر جب اللہ نے قطع ید کا حکم دیا تو اللہ کا حکم اس میں شامل ہو گیا۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ فرمایا: جو معاملات خالص بندوں کے حقوق ہیں ان میں فریق متضرر خود عدالت میں آ کر مدد طلب کرے کسی اور کے کہنے پر مقدمہ درج نہیں ہونا چاہئے۔ (۷)۔ سرقہ، قذف اور قصاص میں فرد متضرر کو خود مقدمہ درج کرانا ہوگا۔ البتہ اگر قتل کا واقعہ معاشرے میں معروف ہو چکا ہو تو ریاست کو از خود مقدمہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں کہ جب مقدمہ عدالت میں آ جائے تو اس کے بعد فرد متضرر کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ فرمایا: فهل لا قبل ان تاتی به؟(۸) الا ان تنتهک من حرمات الله؟(۹)۔

حدود کا جرم ثابت ہو جائے تو ان کی سزا ناقابل معافی اور ناقابل راضی نامہ ہیں۔ حدود کا مقدمہ عدالت میں آ گیا تو متعلقہ متأثر شدہ فرد (فرد متضرر) کا معاف کرنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ صفوان بن امیہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ایسے شخص کو لیکر حاضر ہوئے جس نے ان کی چادر چوری کی تھی، آپ ﷺ نے جب اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر فرمایا تو صفوان بن امیہ نے کہا یا رسول اللہ میں اسے معاف کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ کہ کر قطع ید کی حد نافذ کر دی کہ تم نے میرے پاس آنے سے پہلے یہ کام کیوں نہ کیا۔ (۱۰) اس کے علاوہ کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب (مثلاً حرابہ) شرعی طور پر دہرا جرم ہے۔ اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حق سلبی ہے، دوم یہ کہ بے حیائی کا ارتکاب ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ حدود کو اللہ کا حق اس لیے کہا گیا ہے یہ گناہ ہر علاقے اور ہر زمانے میں عام پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق معمولی کوتاہی قومی اور بین الاقوامی فساد کا سبب بنتی ہے اس لئے حدود کا عدم نفاذ موجب فساد ہے۔

حضرت عمرؓ کے مبارک دور سے ایک روایت قائم کی گئی جو اسلامی قانون کا حصہ بن گئی ہے وہ یہ کہ حدود میں جب عدالتی فیصلہ آ جائے تو امیر المؤمنین سے اس کی توثیق کرانا لازم قرار دیا گیا۔ لیکن اس اصول کا مقصد ریاست کو معافی کا حق دینا ہر گز ہر گز نہیں ہے بلکہ یہ صرف احتیاط ہے اور آخری مرتبہ کی تحقیق ہے کہ ملزم واقعی گناہ گار ہو تب اسے سزا ملے۔ شاید اسی حکم کی وجہ سے ایک بڑی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام

ریاست کو حدود میں معافی کا اختیار دیتا ہے۔ دستور پاکستان کے دفعہ ۴۵ میں یہی ہے کہ عدالتی سزا کو کم کرنے یا بدلنے کا یا بالکل ختم کرنے کا اختیار صدر پاکستان کو ہے۔ پھر ۷۹ء کے صدارتی آرڈیننس میں یہ کہا گیا کہ معاف کرنے کا حق صرف فریق متضرر کو ہے۔ دستور پاکستان ہر اصول اور فیصلہ شرع اسلام سے ہٹ کر محض قانون کی تشریح کے طور پر کسی وکیل اور جج کی رائے کے تابع نہیں ہو سکتا ہے بلکہ قانون پاکستان کو قانون اسلام کے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ طرز عمل تہذیب مغرب کا ہے کہ وہ اپنے قانون کو محض اپنے وکلاء اور قانون دانوں کی تشریح سے جوڑتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اگر کسی قانون کو اسلامی قانون سے مربوط نہ رکھے تو اس کے ایمان کی کمزوری سامنے آنے لگتی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم کا یہ فرق اسلام کا بیّن اصول ہے جو سورۃ الکافرون میں موجود ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۱۱)

لہٰذا مذکورہ بالا دفعہ ۴۵ اور صدارتی آرڈیننس دونوں حوالوں کو اسلامی اور قرآنی توضیحات سے جدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کی وہ تعبیر پیش کرنا لازم ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔ اور وہ تعبیر واضح طور پر صرف یہ کہ فریق متضرر کے لیے کسی سزا کو معاف کرنے کا اختیار محدود ومشروط طور پر اور بعض صورتوں میں ہے، جبکہ حاکم کے لیے کسی سزا کو معاف کرنے کا اختیار بالکل نہیں ہے بلکہ حاکم کا اختیار محض تحقیق احوال کی وجہ سے ہے۔ اس لیے حدود کی سزا جب اسلامی شرائط ومنہج کے مطابق ثابت ہو جائے تب کسی کے پاس معاف کرنے اور بدلنے کے اختیارات نہیں ہو سکتے۔ ممالک اسلامیہ میں حدود کی تنفیذ میں لیت ولعل کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے اصل محرکات یہ ہیں کہ مغربی مفکرین مسلسل اسلام کو بدنام کرتے ہوئے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ اسلامی سزائیں وحشیانہ اور ظالمانہ ہیں اور نہایت پرزور طریقے سے اسلام کو ہدف تنقید بنا کر یہ کہا جارہا ہے کہ اسلامی سزاؤں میں انسانی نفسیات، معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس لیے ایک مسلم خواہ عوام سے اس کا تعلق ہو یا انتظامیہ یا عدلیہ سے یا قانونی اداروں سے ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اسلام کے فطری، عادلانہ، مشفقانہ اور رحیمانہ قانون کی حقیقت واہمیت کو سمجھے۔

اسلام کا قانون انسانی معاشرے میں انسانوں کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کے لیے نظام عدل قائم کرتا ہے کیونکہ انسانی معاشرے کے ارتقاء اور تمام سماجی عوامل کا انحصار ایسے نظام عدل پر ہے، یہاں تک کہ چاند دیکھنے کی دعاء سکھلائی "اللهم أهله علينا بالأمن و الإيمان و السلامة و الإسلام ربي و ربك الله "(۱۲) امن کو ایمان سے اور سلامتی کو اسلام سے صرف مربوط نہیں کیا گیا بلکہ ظاہری اعتبار سے امن کو ایمان پر اور سلامتی کو اسلام پر مقدم کرکے یہ باور کرایا ہے کہ امن وسلامتی کے بغیر مذہبی احکام کی پیروی ناممکن ہے تاکہ

مسلمان امن کو اولین اہمیت دے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت کے ترک پر حدود کے قوانین اسلام میں نہیں دیئے گئے بلکہ اس طرح کے جرائم کی سزائیں تعزیرات کے تحت آتی ہیں۔ اسلام نے انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے جہاں حدود کا قانون پیش کیا ہے، اس کے ساتھ یہ تصور بھی دیا گیا کہ انسان اپنا ذاتی حق چاہے تو معاف کر سکتا ہے لیکن اللہ کا حق معاف نہیں کر سکتا۔

حیرت انگیز بات یہ کہ ترکِ عبادت پر کوئی حد کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ البتہ چوری، زنا اور قتل کی سزا کو اللہ کا حق قرار دیا گیا اور واضح کہا کہ ترک نماز بھی جُرم ہے اور چوری بھی مگر چوری کے جرم پر ہاتھ کٹے گا اور نماز کے ترک پر اُنگلی کٹنے کا اصول بھی نہیں۔ نیز یہ کہ ترکِ نماز اور چوری دونوں جرائم ہیں اور دونوں جرائم کوئی شخص معاف نہیں کر سکتا۔ ترکِ نماز کی سزا جہنم میں ہوگی اور توبہ سے معاف بھی ہو سکتی ہے، لیکن چوری کی سزا نہ تو کوئی انسان معاف کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ توبہ سے معاف ہوگی۔ بالکل واضح ہے کہ یہ چیز صرف اور صرف انسانی معاشرے کی پاکیزگی اور قیام امن وسلامتی کے لیے ہے۔ اس لیے یہ تصور دیا گیا کہ ان مخصوص سزاؤں کا نام حُدود ہے اور یہ فیصلہ ارض وسماء کے فاطر کی طرف سے ہے، اس میں تبدیلی ممکن نہیں ہوگی۔

ثابت ہوا کہ معاشرتی امن کے قیام کا یہ اہتمام کسی انسانی منصوبہ بندی یا انسانی تجربات کا نتیجہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ (۱۳)، فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ (١٤)، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (١٥)، سُورَةٌ أَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَأَنْزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (١٦)، لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ (١٧)، وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (١٨)- مذکورہ آیات بتاتی ہیں کہ یہ جرائم چونکہ روئے زمین پر ہر علاقے اور ہر قوم میں ہمیشہ موجود ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے تمام معاشی اور سیاسی بین الاقوامی جرائم مثلاً غلامی اور غلام اقوام کا اجتماعی قتل، ان کا اجتماعی مال استحصال، خواتین کی اجتماعی بے حرمتی اور نسلوں کی تباہی معرض وجود میں آتی ہیں۔ اس لیے قتل، چوری، زنا، الزام اور بہتان جیسے جرائم کی وجہ سے جان، مال وعزت کا عدم تحفظ نہ صرف دنیا کی ہر قوم میں یہ امن بقائے باہمی اور انسانی پُر سکون ماحول کے قیام میں رکاوٹ ہیں بلکہ تجارت، زراعت، سیاست، تہذیبی ارتقاء اور خیر وفلاح کے حصول میں بھی سد راہ ہیں۔ انسان کو جس طرح جان، مال کے تحفظ کی ضرورت ہے اسی طرح عزت ونسب اور خاندانی نظام کی ضرورت ہے اس کے لئے فکری اصلاح، نیک نامی، قلبی سکون ضروری ہے۔ اس بنا پر اسلام کے مطالعہ سے فقہائے کرام نے پانچ عوامل یعنی جان، مال، عزت، عقل اور دین کے تحفظ کو شرعی احکام کے مقاصد خمسہ قرار دیا ہے۔

اسلام کا قانون اپنے خاص فکری، عبادتی اور اخلاقی ماحول میں ایک اجتماعی معاشرہ قائم کرتا ہے۔ ان تمام کا مقصد جان ومال، عزت، عقل اور دین کا تحفظ ہے۔ جس وقت فکری طہارت (ایمان)، عباداتی ذوق اور اخلاقی اقدار سے مسلم معاشرہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے تب بھی مقصود جان ومال وعزت کا تحفظ ہوتا ہے، لیکن ان عوامل کی حیثیت قانونی سے بڑھ کر مذہبی اور دینی ہوتی ہے۔ تو اس طرح جانی، مالی اور توقیری جرائم کے تحفظ میں ایک طرح کی غیر قانونی مدد حاصل ہوتی ہے۔ پھر جب قانون عملاً نافذ ہوتا ہے اور اس میں بھی وضعی قوانین کے مقابلے میں اسلامی قانون میں گناہوں اور جرائم کی سزائیں جو کہ حدود کے نام سے مقرر کی گئی ہیں ظاہری طور پر ان میں یک گونہ سختی معلوم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے مغربی تہذیب ان حدود کو وحشیانہ سزائیں کہہ کر بدنام کر رہی ہے۔ لیکن اس کی حکمت سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اسلام کا مقصود معاشرتی برائیوں کا مکمل خاتمہ ہے۔ مغربی معاشروں میں جن معمولی سزاؤں کا تصور پایا جاتا ہے اور جس کو وہ مہذب سزائیں قرار دیتے ہیں ان کا گہرا مطالعہ اور دونوں سزاؤں کا موازنہ بہت ضروری ہے۔

مغربی خفیف سزائیں انسانی معاشرے میں جرائم کے سد باب میں ناکام ہیں اور تمام انتظامی عدالتی اور قانونی محرکات کے باوجود مغربی معاشروں میں برائی اور جرائم کا وقوع کثرت سے موجود ہے۔ اس کے برعکس جہاں پر اسلام مکمل طور پر نافذ ہو وہاں سے برائیوں کی جڑیں کٹ جاتی ہیں اور اسلام کا باحیا معاشرہ قائم ہوتا ہے اور اس میں ظلم وعدل کو ایک ساتھ چلنے کا موقع نہیں ملتا۔

اسلامی سزاؤں کی اصل حکمت یہ ہے کہ سزا کے اندار ایک طرف سخت پہلو اپنا کر سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں مگر دوسرا پہلو یہ کہ حدود کے نام پر سزاؤں کی تعداد بہت کم ہے اور اس کے بعد تعزیرات کا باب اتنا وسیع ہے کہ اس کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر گواہی اپنی مقررہ مقدار سے کم یا دلائل میں کسی قسم کا شبہ ہو تو حد جاری نہیں کی جاسکتی اور وہ سزا تعزیر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ سزا کی بعض صورتوں میں متأثرہ فریق یا اس کے ورثاء کو سزا کے معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ حدود اسلامی کے مذکورہ دونوں پہلوؤں کے پیش نظر غور وفکر کیا جائے تو اسلام کی عظیم حکمت سمجھ آتی ہے، جس کا تصور بھی وضعی قانون میں نہیں لایا جاسکتا کہ ایک پاکیزہ، عبادت گزار، بااخلاق اور مہذب معاشرہ میں حدود کی سزاؤں کا وقوع قلیل سے قلیل ہو جاتا ہے اور اس مجموعی صورت حال میں قانون حدود کے تحت جو سزا دی جاتی ہے جس سزا کے واقع کا امکان رہ جاتا ہے وہ مغربی معاشرے کی اس کثیر الوقع سزا کے مقابلے میں بہت کم ہے جو مغربی سزا بظاہر نرم اور خفیف کہی جاتی ہے۔

دراصل انسان کے اندر غصہ اور جذبات کا ایسا طلاطم فطری طور پر موجود ہے کہ وہ اپنے عروج پر ہو تو

کسی بڑی سزا کے خوف کے بغیر اسے نہیں روکا جاسکتا اس طرح طرح انسان کے اندرونی منطقی جذبات اور اس کے شر سے دوسرے انسانوں کو اور ان کے حقوق کو محفوظ رکھنا ممکن نہیں ہے۔انسانی فطرت یہ ہے کہ اگر اسے رشوت دینے یا عدلیہ کو طاقت سے دبانے کا موقع ملے یا اسے علم ہو کہ سزا خفیف ہے ان دونوں صورتوں میں اس کے جذبات کا طلاطم خود اس پر غالب آجاتا ہے اور ایک طرح کے نشہ میں مبتلا ہو کر مستقبل کی ممکنہ سزا یا خفیف سزا کو بھول جاتا ہے۔ عفو و درگذر سے مجرم اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کہیں عفو و درگذر سزا دینے سے زیادہ مؤثر اور اصلاح کے کام میں کارگر ثابت ہوتا ہے شر پسند افراد کو راہ راست پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں عدل وانصاف پر مبنی قواعد وضوابط ہوں، جرائم پیشہ افراد کے لیے سزا کا تعین ہو تاکہ شر پسند افراد پر امن شہریوں کا امن وسکون برباد نہ کر سکیں۔ اسلام کے تصوّر عدل قضاء میں نرمی اور سختی دونوں پہلو ہیں، جرم ثابت ہونے پر مجرم پر ترس کھانے کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔ حدود میں بھی جرم ثابت ہونے سے قبل نرمی کرنے کی تاکید کی گئی ہے سنت مطہرہ میں بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ عفو و احسان کا مقام قانون عقوبت سے بلند ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب قانون عدل حرکت میں آتا ہے تو پوری سختی اور شدت کے ساتھ آتا ہے۔آپ ﷺ کا یہ قول مبارک احادیث کی متعدد کتب میں موجود ہے۔

عن عائشةرضی اللّٰہ عنہاقالت،قال رسول اللّٰہﷺادرؤا الحدودعن المسلمین مااستطعتم فان کان لہ مخرج فخلواسبیلہ فان الامام ان یخطئ فی العفوخیرمن ان یخطی فی العقوبة(۱۹)

عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ممکنہ حد تک مسلمانوں سے حدود کو ساقط کرو، اگر بچنے کی کوئی صورت ہو تو اس کو چھوڑ دو، کسی حاکم کا معافی میں غلطی کرنا سزا میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح عدلیہ کے قیام کے باوجود رشوت اور عدلیہ کو خوفزدہ کرنے کا امکان ہو تو معاشرہ میں عدلیہ کے وجود کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اور قانون ایک مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر جرم کی سزا کا تصور خفیف ہو تب بھی سزا کا تصور ایک مذاق بن جاتا ہے اور لاقانونیت موجود رہتی ہے۔ گناہ اور جرم معاشرے کے پاکیزہ اور بے گناہ افراد کو تختہء مشق بناتا رہتا ہے۔ آج کا مغربی معاشرہ اس کی واضح گواہی دے رہا ہے۔ اسلام کی نظر میں اصل فساد رب کی نافرمانی ہے اور یہی مغربی اور سلامی تہذیب کا فرق ہے کہ اسلام کا مذہبی تصور جرائم کی نفرت دیتا ہے مگر مغرب کا مادہ پرست نظریہ ایک طرف جرم کی مذمت دبے لفظوں میں کرکے دوسری طرف آزادی کے تصور میں جرائم کی محبت فراہم کرتا ہے۔ یہ فکری تضاد ہے، اس لئے کہا

جاسکتا ہے کہ سخت نقصان دہ جرائم کی سزا میں خفت در حقیقت جرم کے بعض پہلوؤں سے معمولی کراہت کا تصور ہے، جو کہ جرائم کے فروغ کا بنیادی سبب ہے۔

تہذیب مغرب کا ایک بنیادی مسئلہ اصولی تضاد ہے اور اس کے ساتھ اس کے قوانین میں بڑے بڑے خلا ہیں اور ان تمام مسائل کا حل اسلام کے قوانین میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے مغرب جہاں دیکھتا ہے کہ اس کے مقاصد ان کے قوانین کے تحت پورے نہیں ہو رہے تب وہ آزادی، حقوق انسانی، حقوق نسواں اور نرم سزاؤں کے تصورات کو فراموش کرکے کھلے عام درندگی اور فساد کا راستہ اختیار کرلیتا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سزا کے بارے میں دو طرح کے تصورات بنالیتا۔ ایک عمومی حالات اور دوسرے جنگی حالات اور ہنگامی حالات کے لئے بھی وہ ممکن حد تک عدل کی راہ اختیار کرتے ہوئے یہ واضح کرتا کہ جب جرائم اپنی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں تب سخت سزا کا تصور متعارف کرایا جائے گا، لیکن اس نے نہایت متعصبانہ اور سخت غیر مہذب رویہ اختیار کیا جس سے یہ ثابت کیا وہ اپنی قوم کے لیے نرم سزا اور دوسری اقوام کے لیے سخت اور نہایت سخت سزا کا تصور رکھتا ہے اور یہ ایسا قانون ہے جسے بظاہر مرتب نہیں کیا گیا مگر خفیہ طور پر اسے قانون کی حیثیت سے اپنایا گیا اور کاش کہ ایسے موقع پر بھی حقیقی مجرموں کو شفاف عدالت کے ذریعے سے فرد جرم عائد کر دیتا تو کسی حد تک بہتر ہوتا مگر ایسے موقع پر محض تعصّباتی راستہ اپنا کر عدل وانصاف کی سرعام مخالفت کی گئی ہے۔ مغرب کا یہ رویہ بالکل واضح کرتا ہے کہ اسلام نے جس طرح کی سخت سزا کا اسلوب اختیار کیا ہے اس میں توازن اور حقیقت پسندی ہے جبکہ مغربی وضع کردہ سزاؤں کا تصور غیر متوازن اور انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

اسلام چونکہ مالک کائنات کا عطا کردہ ایک فطری نظام حیات ہے اس نے وہ اصول عطا کیے ہیں کہ انسان مذہبی، لسانی، علاقائی تفریق اور جانبدارانہ ذہنیت سے پاک ہو اور وہ تمام انسانوں سے اخلاص اور عدل ورحمت کی بنا پر کوئی نظام قائم کرے اور مختلف ٹیموں کے ساتھ مل کر مسلسل کئی سال کے تجربات کے بعد جو نتائج اخذ کرے گا وہ نتائج بھی ناقص ہو سکتے ہیں لیکن اسلام کے اصول اس طرح کے تجربات سے ماخوذ اصول سے بھی زیادہ مفید اور مکمل ہیں۔ اسلام کا قانون صرف مسلم معاشروں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کے تمام معاشروں کے لیے اتارا گیا ہے۔ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت کی اصلاح کے لیے مقرر کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری مکمل دینی تعلیمات کو ذاتی طور پر صحیح طرح سے اختیار کرنے کے بعد اسے پوری دنیا میں پہنچائے اور جہاں تک ممکن ہو اس نظام کو انسانی معاشروں پر قائم کرے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اسلام کا تصور جہاد بھی در حقیقت ہنگامی صورت میں فساد کا ممکنہ تدارک ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا- ان اللہ لا یحب المعتدین (۲۰) یعنی اسلام جنگ میں بھی ممکنہ حد تک دشمن سے انصاف کا مکمل لحاظ رکھتا ہے۔ اسلام نے صرف اس کافر سے جنگ کی اجازت دی جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہوں اور جو کفار مسلمانوں پر ظلم نہ کریں ان سے نیکی، بھلائی اور انصاف کا راستہ اپنانے کا حکم دیتا ہے۔ جہاں تک اقدامی جہاد کا تصور ہے تو وہ بھی درحقیقت مستقبل کے یقینی فساد کا قبل از وقت علاج ہے تاکہ برائی اور فساد کو بھڑکنے سے قبل گرفت میں لیا جائے ورنہ تو سورۃ البقرہ میں صریح حکم دیا گیا کہ نہ لڑنے والے کافروں سے بھلائی اور انصاف کرو۔ لہٰذا ایسے کافروں سے نہ اقدامی جنگ ہو سکتی ہے اور نہ ہی دفاعی، خواہ ان سے معاہدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ہر صورت میں ان کافروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے دعوت کے ذریعے اصلاح کی کوشش کی جائے گی۔ شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے ضروری ہے غیر طبقاتی اور اسلامی طرز فکر پر مشتمل نظام تعلیم کا قیام عمل میں لایا جائے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام میں شعور پیدا کیا جائے۔

غیر طبقاتی اور اسلامی فکر پر مشتمل نظام تعلیم کا قیام

شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی ناگزیر ہے، کیونکہ کوئی بھی ریاست اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک وہ اپنے چلانے والوں کو تربیت دینے اور ان کو اپنے مقصد کے مطابق تیار کرنے کا انتظام نہ کرے۔ اس لحاظ سے حقیقت میں تعلیم کا مسئلہ حکمرانوں کے لیے، ایک ریاست کے لیے بنیادی مسائل میں سے ہے تعلیم وہ اجتماعی عمل ہے جس کے ذریعے معاشرہ نوخیز نسلوں کو اسلامی تصور حیات سکھاتا ہے اسلامی عقائد واقدار ان کے اذہان میں راسخ کرتا ہے اور اسلامی افکار کی روشنی میں آداب زندگی اور اخلاق کی تربیت دیتا ہے۔ اسلام نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم وتربیت پر زور دیا تاکہ معاشرے کی تعمیر وترقی میں عورت اپنا کلیدی کردار صحیح طریقے سے ادا کر سکے۔ اس بات پر اہل علم کا اختلاف ہے کہ کون سا علم حاصل کرنا فرض ہے، اس ضمن میں آپ ﷺ نے جو ارشاد فرمایا۔

"بني الإسلام على خمس شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله وإقام الصلاة وإيتاء الزكاة والحج وصوم رمضان "(۲۱)

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز کا قائم کرنا اور زکوۃ کا ادا کرنا اور حج اور رمضان کے روزے رکھنا۔"

اس حدیث کی بنا پر ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں کہ علم کی دو اقسام ہیں" علم معاملہ، علم مکاشفہ۔ علم مکاشفہ سے مراد

وہ علم ہے جس پر ہر عاقل بالغ کو جس معاملے پر عمل کا پابند بنایا گیا ہے وہ تین ہیں ،اول اعتقاد ، جن چیزوں پر یقین رکھنا ضروری ہے ،دوم فعل ، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ، سوم ترک فعل۔ یعنی جن افعال سے رکنے یا بچنے کا حکم دیا گیا ہو۔"(۲۲) ترک فعل میں حدود وقصاص والے معاملات آتے ہیں جن کاموں سے رکنے کا حکم نص سے ثابت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے وہ تعلیمی انقلاب برپا کیا کہ دنیا آج تک ایسا تعلیم انقلاب نہیں لا سکی اور نہ لا سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ مکرمہ میں صرف سترہ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی تیئس سالہ محنت کے نتیجہ میں آدھا عرب خواندہ ہو گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد کتاب وحکمت کی تعلیم دینا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پیشہ کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے اسے اپنے لئے پسند فرمایا ہے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ " مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔"(۲۳) لہٰذا ضروری ہے کہ ریاست حدود قصاص کے قوانین کی تنفیذ سے پہلے مستحکم، غیر طبقاتی اور اسلامی فکر پر مشتمل نظام تعلیم کے قیام کا بندوبست کرے۔ امام غزالیؒ نے مقاصد تعلیم یہ بتائے ہیں:

> "اللہ تعالی کی رضا، تعمیر کردار، فکر آخرت ، اعلیٰ اخلاقی اقدار کا فروغ اور مقاصد تعلیم میں تربیت میں پر بہت زور دیا ہے فرماتے ہیں طلباء نفس کو اخلاق رذیلہ سے بچائیں، تزکیہ باطن کی طرف متوجہ ہوں، علائق دنیا سے پرہیز کریں اور ضرورت پڑنے پر گھر سے دور بھی رہنا چاہیے، استاد کی اطاعت کریں، معاشرے کو مختلف فن کے ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے تمام علوم برابر ہیں اور علم وفن وہی اہم ہیں جو معاشرتی نصب العین سے قریب تر ہوں۔علوم کی دو اقسام ہیں ،فرض عین اور فرض کفایہ ۔بنیادی عقائد کا علم حاصل کرنا فرض عین کے درجے میں ہے،اس میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو توحید، عبادت اور شریعت کو سمجھنے میں مدد دیں ، حدود وقصاص اور دیت بھی فرض عین میں سے ہے۔"(۲۴)

ذرائع ابلاغ کے ذریعے معاشرتی اصلاح

انسان کو حیوانِ ناطق کہ کر مفہوم کی ترسیل اور مافی الضمیر کے اظہار کی طرف خوب صورت اشارہ کیا گیاہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور تاریخ کا طویل سفر بڑی حد تک قوت گویائی کا مرہون منت ہے۔ موجودہ علوم و فنون کا سارا ذخیرہ انسان کے بولنے کی اسی صلاحیت کی دہلیز پر سر تسلیم خم کرتے دکھائی دیتا ہے۔ذرائع ابلاغ کے ذریعے رائے عامہ کو مثبت انداز دے کر نہ صرف کسی ملک کے اساسی نظریے کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعے اقتصادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی رویوں کو بھی ٹھوس لائحہ عمل دے کر

مطلوبہ نتائج کے حصول اور قومی کردار کی تشکیل کے عظیم مقاصد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ معاشرے کی تعمیر اور اقتصادی و سماجی ترقی میں ذرائع ابلاغ کو اہم حیثیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ قومیں ان ذرائع ابلاغ کی ترویج و ترقی اور انہیں قومی و ملی مطالبات سے ہم آہنگ بنانے پر بھرپور توجہ دیتی ہیں۔ نئی نسل میں اپنے قومی نظریات اور معاشرت و تہذیب کو منتقل کرنے میں ذرائع ابلاغ انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں اسلئے ان ذرائع ابلاغ کا صحیح رخ متعین کرنا پوری قوم کی ذمہ داری ہے۔اسلام کا نظریہ ابلاغ انفرادی اور اجتماعی سطح پر صالح معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔حکومتی اداروں پر لازم ہے کہ وہ اخلاق باختہ مواد اور حیاسوز مناظر کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے ذرائع ابلاغ کے ذریعے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو پورا کریں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۲۵)

"جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیل جائے یقیناً ان کیلئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔"

صدق و عدل ذرائع ابلاغ کا زیور ہیں، صحت مند اور کامیاب ذرائع ابلاغ کے لیے قرآن حکیم اس کے ذمہ داروں کو فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے اور صدق و عدل کی خصوصیات کو اصلاح اعمال اور عفو تقصیرات کی ضمانت کے طور پر ذکر کرتا ہے۔ "اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات کیا کرو، وہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور گناہوں کو معاف فرمادے گا۔" (۲۵) اسلام تمام افراد اور اداروں کو راست روی کا حکم دیتا ہے اور حتی المقدور راست روی پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ ذرائعِ ابلاغ راست روی پر مبنی معاشرہ قائم کرنے اور قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ذرائعِ ابلاغ کو جہاں کہیں بھی ظلم و ناانصافی محسوس ہو یا راست روی کے برعکس رویہ نظر آئے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے اور مظلوموں کی حمایت میں انسانی غیرت کا ثبوت دینا چاہیے۔ گویا ذرائع ابلاغ انہی اصولوں پر کاربند رہیں گے جو حکمرانوں نے متعین کرنے ہیں، جن پر ریاست عمل پیرا ہو گی اور تمام ذرائع ابلاغ رائے عامہ کی استواری، اسلامی عقائد و روایات کی پاسداری، فحاشی و عریانی سے پرہیز، حدود و قصاص قوانین پر عمل درآمد اور اخلاقی اقدار کے تحفظ میں اسلامی ریاست کے معاون اور مددگار ہوں گے۔

حدود قصاص کی تنفیذ نظام عدل اجتماعی کے قیام کے بغیر ممکن نہیں

دین اسلام کی اعلیٰ ترین قدر سماجی اور تمدنی انصاف ہے۔ اقامت دین کا اصل ہدف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا

عطا کردہ متوازن نظام عدل اجتماعی قائم کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے عدل اجتماعی کے قیام کے لئے اصلاحی کوششوں کو سطح تک محدود رکھنے کی بجائے قلب و ضمیر کی گہرائیوں کو ان کا اصلی ہدف قرار دیا ہے۔آپ ﷺ نے انسانی جسم کی فعالیت میں دل کے کردار کو مرکزی قرار دیا ہے اور اس کی درستگی پر پورے بدن کی اصلاح موقوف ہے،اسی طرح عدل اجتماعی کے قیام و بقاء کے لئے حکمرانوں اور ریاست کے بنیادی ڈھانچہ کی اصلاح ناگزیر ہے۔آپ ﷺ کے پیش نظر چونکہ کامل عدل اجتماعی کا قیام تھا لہٰذا آپ ﷺ نے یہ گوارانہ کیا کہ محض اقتصادی عدل کا محدود نظام بن کر رہ جائے اور یہ بھی مناسب نہیں سمجھا کہ قانونی ذمہ داری ہی اس عدل کے قیام کا واحد سہارا ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے نظام عدل کو ایک وسیع اور ہمہ گیر نظام عدل اجتماعی کی شکل دی اور اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔قرآن حکیم میں آپ ﷺ کا مقصد بعثت ہی نظام عدل اجتماعی کا قیام بتایا گیا ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ(۲۷)

"ہم نے اپنے رُسولوں کو واضح نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "انبیاء کرامؑ کے مشن کو بیان کرنے کے معاً بعد یہ فرمانا کہ ہم نے لوہا نازل کیا جس میں بڑا زور اور لوگوں کے لئے منافع ہیں، خود بخود اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں لوہے سے مراد سیاسی اور جنگی قوت ہے اور کلام کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو قیام عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے، اسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جاسکے اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کا

زور توڑا جاسکے۔"(۲۸) ایک جگہ پر آپ ﷺ کا مقصد بعثت یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو ہدایت اور دین حق یعنی نظام عدل آپ ﷺ کو دے کر مبعوث کیا گیا ہے اسے پورے نظام زندگی پر بالفعل قائم کر دیں۔(۲۹)

اسلام کا نظام عدل روحانی اور مادی دونوں طرح کی اقدار پر حاوی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرکے نافذ کرتا ہے، اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تنفیذ ایک مستحکم اور صالح ریاست کے قیام سے ہی ممکن ہے۔ عدل اجتماعی پر مبنی ایسا نظام قائم کرنا امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے جو لوگوں کی جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کرے اور لوگوں کو قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کا ماحول فراہم کرے۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں عدل اجتماعی پر مبنی نظام کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔ تمام انبیاء کرامؑ وقت کی اجتماعی قوت کو اس کے تابع کرنے، اور زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتے رہے تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین قائم ہو اور اسی کا قانون جاری وساری ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ لوگوں میں شرعی سزاؤں سے متعلق شعور اجاگر کیا جائے، نظام تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو مضبوط بنیادوں پر مستحکم کرتے ہوئے قابل، اہل، ایماندار اور باصلاحیت حکام کا انتخاب اور تقرر عمل میں لاکر حدود قوانین کی تنفیذ کی راہ ہموار کی جائے۔

بلاامتیاز قوانین کا نفاذ

عدل اجتماعی کا طبعی مقصود یہ ہے کہ معاشرہ کے افراد برابر کے حقوق کے مالک ہوں اور ان کے درمیان تباہ کن اختلافات بالکل پیدا نہ ہوں اگر پیدا ہوں تو ترقی نہ کریں۔ اس مقصد کے لیے عدلیہ کا انتظامیہ کی بے جا مداخلت سے آزاد ہونا اور سب پر بالادستی ہونا قیام عدل کی لازمی شرط ہے۔ موجودہ عدالتی نظام اس کے برعکس عوام کے درمیان مستقل کشمکش کو باقی رکھنے اور مقدمہ بازی کو مستقل صورت دینے کا سبب ہے۔ آپ ﷺ نے اوّلاد آدم کے حقوق کی مساوات کا اعلان کیا، قانون کی بالاتری قائم کی اور طاقتور اور کمزور کے لیے یکساں احکام نافذ کئے۔ قریش کے قبیلہ بنو مخزوم کی ایک عورت فاطمہ بنت اسود سے چوری کا جرم سرزد ہو گیا۔ قریش کے کہنے پر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو معافئ سزا کی سفارش کے لیے بھیجا تو آپ ﷺ کا چہرہ انور متغیر ہو گیا اور فرمایا تم خدا کی مقرر کردہ حد کو معاف کرنے کی سفارش کرتے ہو اور پھر خطبہ ارشاد فرمایا۔

يأيّها النّاس إنّما ضلّ من كان قبلكم انهم كانواذاسرق الشريف تركواه واذاسرق الضعيف فيهم اقامواعليه الحد وأيّم اللّه لوا ن فاطمة بنت محمدﷺ سرقت لقطعت

یدھا-(۳۰)

اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ جب کوئی شریف زادہ چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور "اگر کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد نافذ کردیتے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنتِ محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

عبداللہ بن جبیر خزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ یا مسواک تھی جس سے ایک شخص کے پیٹ میں معمولی سی خراش آ گئی تو اس نے کہا" أو جعتنی فاقدنی "کہ آپ ﷺ نے مجھے درد پہنچایا ہے اس لیے مجھے بدلہ لینے کی اجازت دیں۔ آپ ﷺ نے وہی شاخ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے بدلہ لے لو۔ اس شخص نے آپ ﷺ کے پیٹ مبارک کا بوسہ لیا اور کہا میں نے آپ ﷺ کو معاف کیا امید ہے آپ ﷺ روز قیامت میری شفاعت فرمائیں گے۔ (۳۱) ایک دوسری حدیث کچھ الفاظ کے اضافے کے ساتھ کچھ یوں ہے کہ اس شخص نے آپ ﷺ کی ناف مبارک کا بوسہ لے کر چھڑی کو پھینک دیا اور عرض کیا یا نبی اللہ ﷺ میرا مقصد یہ تھا کہ ہم آپ ﷺ کے بعد ظالموں کی سرکوبی کر سکیں اور ان سے اپنا بدلہ لے سکیں۔" (۳۲)

پاکستانی عدلیہ کا دہرا معیار

پاکستان کے عدالتی نظام کا جائزہ لیا جائے تو ملکی قانون کی توقیر، مروجہ عدالتی نظام اور ججز حضرات کا امتیازی رویہ واضح ہو جاتا ہے۔ ۲۷ جنوری ۲۰۱۱ کو ممتاز قادری نے گورنر پنجاب پر توہین رسالت کے ارتکاب جرم کا دعویٰ کرکے اسے قتل کر دیا جبکہ اسی ماہ ۲۷ جنوری کو ریمنڈس ڈیوس نے لاہور کی ایک مصروف شاہراہ پر دو معصوم شہریوں کو فائرنگ کرکے قتل کر دیا۔ بعد ازاں ریمنڈس ڈیوس کو بچانے کے لئے آنے والی گاڑی کے ڈرائیور نے ایک اور شہری کو کچل ڈالا۔ ان دو کیسوں کے سلسلے میں ہماری عدالتوں کا امتیازی رویہ اہل دانش کو دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ دہشت گردی کی عدالت جہاں عام طور پر سپیڈی ٹرائل ہوتا ہے، نے ممتاز قادری کیس کا فیصلہ کرنے میں دس ماہ صرف کئے جبکہ ریمنڈس ڈیوس کیس کا فیصلہ دو ماہ سے بھی کم مدت میں یعنی ۱۶ مارچ ۲۰۱۱ کو فیصلہ سامنے آگیا۔ ریمنڈس ڈیوس کو دہشت گردی ایکٹ سے بچا کر تعزیرات کی عام دفعات لگا کر ۴۹ دن کی قید اور ۲۰ ہزار روپے جرمانہ کیا گیا، مقتولین نے اسے معاف کیا یا خون بہالیا آج تک قوم سے مخفی ہے۔

عدلیہ کی بالادستی کے دعوے تو عموماً سب حکومتیں ہی کرتی ہیں مگر جب اس عدل کی زد بڑوں پر پڑتی نظر آتی ہے تو اس بالادستی کو تباہ کرنے کے کئی حربے اختیار کئے جاتے ہیں، مقنّنہ حرکت میں آکر قانون میں

ترمیم کردیتی ہے یا عدلیہ سے متعلق کاموں میں کئی طریقوں سے رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔اسلام میں سزاؤں کی تنفیذ کے اصول مستحکم ہیں، یہ کسی قانون ساز ادارے یا سوسائٹی کا بنایا ہوا نہیں ہے کہ اس میں حذف و اضافہ کی گنجائش باقی رہے۔ قانون سازی کا اختیار اللہ تعالی کو ہے۔ قوانین کی حدود مقرر کردی گئی ہیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں حدود و قیود کے اندر قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ قرآن و سنت کے منافی نہ کوئی قانون وضع کیا جاسکتا اور نہ ہی نظریہ ضرورت کا سہارا لے کر کسی کے بنیادی حقوق کو تلف کیا جاسکتا ہے۔آپ ﷺ نے تو چوری کے جرم میں قطع ید سے متعلق رحم کی اپیل کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ مرتکبین کو نہایت سست کہا اور ملامت کی جبکہ مملکت خداد پاکستان میں صدر پاکستان کو قاتل کو معاف کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔

شرعی سزاؤں کی تنفیذ میں حکومتی اختیارات اور انصاف کی فراہمی میں حائل رکاوٹیں

شرعی سزاؤں کی تنفیذ کے لیے ضروری ہے کہ ریاست کی عدلیہ اسلام کے فراہم کردہ نظام عدل کی بنیاد پر استوار کی گئی ہو اور منصف کے تقرر، مقدمہ کی سماعت اور دیگر عدالتی کاروائی میں اسلام کے اصول ہائے عدل کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو اگر ریاست کی عدلیہ اسلامی نظام عدل کے بنیادی تقاضوں کو پورا نہیں کر رہی تو تنفیذ حدود کے لیے یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے جس کی موجودگی میں ایک مجرم کو شرعی سزا نہیں دی جاسکتی۔ بلا تاخیر انصاف کی فراہمی کے لیے عدالت کو جن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے اس سلسلے میں عمر رضی اللہ عنہ کا وہ خط قابل ذکرہ جو آپ رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو عدالتی امور سے متعلق تحریر کیا۔

> "اچھی طرح سمجھ لو کہ قضاء ایک دینی ذمہ داری ہے جو سنت نبوی ﷺ کے مطابق بجا لانا ضروری ہے جب کوئی شخص اپنا مقدمہ تمہارے پاس لائے تو کامل غور و فکر کے ساتھ اس کی باتیں سنو، اور جب تم فریقین کی باتیں سننے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ تو اس کا نفاذ بھی کرو۔ کیونکہ درست فیصلے کرنے کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک اس فیصلے کا نفاذ نہ کیا جائے، تمام لوگوں کو اپنے سامنے اور اپنے انصاف میں برابر رکھو تاکہ کمزور اور غریب آدمی انصاف سے مایوس نہ ہوں، اور زبردست اور طاقتور کو تم سے کسی رو رعایت کی امید نہ ہو۔ جو شخص دعوی کرے، اس کے ذمے ثبوت پہچانا ضروری ہے اور جو اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی تردید کرے اس پر اس سے قسم لینا ضروری ہے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے لیکن یہ ایسی صلح ہو جو حلال کو حلال رکھے اور حرام کو حرام رہنے دے اس کے مقابلے میں ایسی صلح جائز

نہیں جس سے حرام حلال اور حلال حرام ہو جائے ،اگر کوئی شخص اپنے حق کو ثابت کرنے کی خاطر فوری طور پر ثبوت مہیانہ کرسکے تو اسے کچھ عرصہ کی مہلت دو اگر اس عرصے میں وہ ثبوت مہیا کر دے تو اس کا حق اسے دلادو۔ لیکن اگر مدت کے اختتام تک وہ ثبوت بہم نہ پہچاسکے تو مقدمہ خارج کر دو، ایسا کرنے سے اتمامِ حجت ہو جائے گی اور شک بھی دور ہو جائے گا اگر تم نے آج کوئی فیصلہ کیا ہے لیکن مزید غور و فکر اور عقل سے کام لینے کے بعد، تمہیں وہ فیصلہ غلط معلوم ہوا اور حق بات ظاہر ہو جائے تو پہلے فیصلے سے رجوع کرنے میں تمہیں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے کیونکہ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اسے کوئی چیز بدل نہیں سکتی اور باطل پر اصرار کرنے سے حق کی طرف رجوع کرنا بہر حال بہتر ہے۔ سب مسلمان قابلِ اعتبار ہیں، سوائے ان اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں کوڑے لگائے گئے ہوں یا جنہوں نے جھوٹی گواہی دی ہو یا جن کا نسب مشکوک ہو۔جب کسی مسئلے کے بارے میں آپ کے دل میں شک و شبہ پیدا ہو اور کتاب اللہ اور سنت نبوی ﷺ میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر خوب غور و فکر کرو، پھر اس کی مثالوں اور نظیروں کو دیکھئے۔ اس کے بعد قیاس سے کام لیجئے۔اور جو قیاس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے زیادہ قریب ہو اس کے مطابق فیصلہ کیجئے۔ مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت تنگ دلی کا اظہار نہ کرو۔ فریقینِ مقدمہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ مقدمہ پیش ہونے کے وقت بد خلقی نہ دکھاؤ، اگر مقدمہ کا صحیح فیصلہ کروگے تو اللہ تعالیٰ اس کا بہت اجر دے گا ، جس شخص کی نیت ٹھیک ہوگی اور خواہ اسے اپنے عزیز واقارب کے خلاف ہی فیصلہ کرنا پڑے، لیکن وہ حق و انصاف کے راستے پر گامزن رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا ہر طرح سے کفیل ہوگا۔ لیکن جو شخص جادہء عدل وانصاف سے بھٹک جائے گا اور ایسا فیصلہ کرے گا جس پر خود اس کا دل مطمئن ہونے کے لیے تیار نہ ہوگا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو صرف اس صورت میں ثواب کا حقدار ٹھہرائے گا جب وہ اپنے اعمال خلوصِ نیت کے ساتھ بجالائیں گے۔ تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔"(۳۳)

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ عدلیہ کی آزادی کا آغاز ججوں کے صحیح تقرر سے ہوتا ہے، لیکن بالآخر اس کا انحصار جج کے کردار اور شخصیت پر ہے۔ اگر پاکستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ جو قانون اور روایات ہمارے ملک میں کارفرما رہی ہیں، وہ کوئی اچھی مثال پیش نہیں کرتیں۔ ججز کے تقرر کے لیے صاف اور شفاف طریقہ کار ہونا ضروری ہے اور سلسلے میں کسی کو صوابدیدی اختیار حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ ججوں کے تقرر کے لیے دستوری ترمیم کے ذریعے بالکل آزاد ایک ادارہ نیشنل جوڈیشل کمیشن قائم کرنے کی اشد ضرورت

ہے۔ ججوں کی مدت ملازمت پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد مختلف بامعاوضہ ذمہ داریوں کے لیے ان کے دستیاب ہونے کے بھی اچھے نتائج سامنے نہیں آتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہو گا کہ ریٹائرمنٹ کی عمر بڑھائی جائے، پنشن میں اتنا اضافہ ہو کہ ان کو ملازمت کی حاجت نہ رہے اور ان کی صلاحیتوں سے صرف تعلیم و تحقیق اور نیم عدالتی نوعیت کے کاموں میں فائدہ اٹھایا جائے، جس کی تنخواہ نہ ہو بلکہ ضروری سہولیات فراہم کی جائیں۔

شرعی سزاؤں کی تنفیذ میں پیشہ ورانہ وکالت رکاوٹ ہے

وکالت کو بطور پیشہ اختیار کرنا اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں عوام الناس اپنے معاملات کو قانون سے عدم واقفیت کی وجہ سے عدالت میں خود پیش نہیں کر سکتے، کیونکہ دعوی دائر کرنے کے لیے ایک خاص طریقہ کار مروج ہے اور عامۃ الناس اس طریقے سے ناواقف ہیں۔ علاوہ ازیں عدالت میں پیشے کے لیے وکیل کا کسی مسلمہ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری کا حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ وکالت کو بطور پیشہ معاشرے نے قبول کر لیا ہے، اب اس کو ختم کرنا ممکن بھی نہیں۔ وکلاء کو کیس لینے سے پہلے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ جس کا کیس لڑنے جا رہے ہیں وہ حق پر ہیں یا نہیں۔ وکلاء کو پیسے کے لالچ میں جرائم پیشہ اور قاتلوں کے کیس نہیں لینے چاہییں تاکہ معاشرے سے جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی خود بخود ہو جائے اور مجرموں کے ذہن میں آ جائے کہ ان کا کیس بھی کسی نے نہیں لڑنا لہٰذا ضروری ہے کہ اس پیشہ کی اصلاح پر توجہ دی جائے۔

اگر اس قسم کے مستقل پیشہ ور وکلاء موجود ہوں جو مدعی سے فیس لے کر قانونی موشگافیوں، فقہی جزئیات اور شاذ اقوال نکال کر قاضیوں اور ججوں کو مرعوب اور درست شرعی رہنمائی کی بجائے اپنے مقدمے کو کامیاب کرنے کے سارے ماہرانہ حربے استعمال کریں تو اس طریقے سے عادلانہ نظام قائم نہیں ہو سکے گا۔ اگر خدا کا خوف دامن گیر نہ ہو اور مطمع نظر محض فیس کا حصول ہو تو اسلامی قانون ہی کے نام پر بھی ظلم و جور کے دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں موجودہ دور کی طرح وکالت کا پیشہ ایک مستقل ذریعہ اکتساب رزق کے طور پر ثابت نہیں۔ اسلامی نظام عدل کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قاضیوں اور ججوں کی مجالس کے ارد گرد سینکڑوں اشخاص شرعی قوانین و احکام کی مہارت کی اسناد اور لائسنس حاصل کیے ہوئے اس

انتظار میں بیٹھے ہیں کہ کوئی گاہک آئے گا۔ مافی الضمیر کے طور پر " اعلاء السنن " کی مندرجہ ذیل عبارت قابل توجہ ہے۔

"جو کوئی موجودہ زمانے کے وکیل حضرات کے حالات کا آنکھوں دیکھے مشاہدہ کرے کہ وہ کس طرح باطل کو حق ثابت کرتے ہیں اور حق کو باطل بنادیتے ہیں تو اس کو اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا کہ امام ابو حنیفہؒ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ بالکل درست تھا اور یہ کہ سنت نبوی ﷺ کے فہم میں وہ کس قدر باریک بین اور حقیقت شناس تھے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ اگر وکالۃ بالخصومات کا یہ دروازہ بند کر دیا جائے اور فیصلہ کرنے والے قاضی حضرات مدعی اور مدعا علیہ کی بات بلاواسطہ خود ان کی زبانی سنیں اور گواہی دینے والے خود براہ راست ان کے سامنے گواہی دیں اور وکلاء حضرات گواہوں کو پٹی نہ پڑھایا کریں تو قاضیوں کے سامنے جب مقدمات پیش ہو جائیں تو پہلے ہی دن اس مقدمے میں واضح ہو جائے گا کہ ان میں سے کون حق پر ہے اور کون ناحق۔ اکثر باطل کی پہچان میں تاخیر واقع ہو جاتی ہے اور جلد فیصلہ نہیں ہو سکتا تو اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ وکلاء حضرات خواہ مخواہ تلبیس کرتے ہیں، حق کے خلاف باطل کی حمایت میں حیلے بیان کرتے ہیں اور اپنی فنی مہارت سے حق و باطل کو خلط ملط کرکے معاملے کو مشتبہ بنادیتے ہیں، اصل فقیہ وہ ہوتا ہے جو اپنے زمانے کے حالات کو دیکھ کر اور ان کو پیش نظر رکھ کر احکام بتادیا کرے۔ گویا فقاہت کا تقاضا یہی ہے کہ پیشہ ورانہ وکالۃ بالخصومہ کی اصلاح کی جائے۔" (۳۴)

عدل رسانی میں تاخیر عدل کی نفی کے مترادف ہے۔ایسے معاشرے میں انصاف بھلاکیسے ممکن ہے جہا ں کامیاب وکیل وہ شمار ہوتا ہے جو لمبی پیشی دلوانے میں کامیاب ہو جائے۔ بلا تاخیر انصاف کی فرہمی وکلاء کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے ہوگاجب وکلاء اپنے حقیقی منصب اور ذمہ داری کا پاس کریں۔ قوانین کی بالادستی، شرعی سزاؤں کی تنفیذاور عوام کو فوری اور بلا معاوضہ انصاف مہیا کرنا حکومتی فرائض میں شامل ہے۔ ملک پاکستان میں صورتحال یہ ہے کی اپنے حق کے حصول کے لئے بھی عمر خضر اور زر کثیر درکار ہے ۔ قوانین کی تنفیذاور بلامعاوضہ انصاف کی فراہمی کے لیے موجودہ نظام عدالتی نظام اور پیشہ وکالت میں اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

حصول انصاف کے لئے کورٹ فیس کا خاتمہ

انصاف رسانی حکومت کا ایک اہم فریضہ ہے جس کی تائید نصوص سے صراحتا ہوتی ہے ۔قرآنی

آیات، مستند احادیث اور آئمہ مجتہدین کی آراء کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے وہ نسل، جنس اور رنگ کی تمیز کئے بغیر تمام باشندوں کو بلا اُجرت انصاف کے حصول کی ضمانت دے۔ لہٰذا حکومت دیوانی، فوجداری اور آئینی مقدمات میں جتنی جلدی ممکن ہو کورٹ فیس کی وصولی کے نظام کو ختم کرے۔ یہ بات درست ہے کہ موجودہ قانون مجموعہ ضابطہ دیوانی میں مفلس مدعی کی طرف سے اپنے آپ کو مفلس ثابت کر دینے کے بعد دعویٰ دائر کرنے کے مرحلے پر کورٹ فیس لگانے کی پابندی عائد نہیں کی جاتی لیکن مقدّمہ دائر کرنے سے پہلے سائل کو اپنی مفلسی ثابت کرکے کورٹ فیس کے بغیر مقدّمہ دائر کرنے کی اجازت حاصل کرنے کا طریقہ انتہائی پیچیدہ ہے جس سے مدعیان کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچتا لہٰذا اس طریقہ کار کو بھی سہل بنانے کی ضرورت ہے. (۳۵) سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقمطراز ہیں:

> ملک کے نظام عدل وانصاف کو اسلامی معیار پر لانے کے لئے ایک اور ضروری اصلاح یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں سے کورٹ فیس بالکل اڑادیں یہ ایک ایسی گھناؤنی بدعت ہے جس سے ہم مسلمان مغربی تسلط سے پہلے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے اسلامی مزاج پر یہ تصور ہی گراں ہے کہ عدالت دادرسی کی خدمت انجام دینے کے بجائے انصاف کی دکان بن کر رہے۔ جہاں سے کوئی شخص پیسہ دیئے بغیر جنس عدل حاصل نہ کر سکتا ہو۔ اور جہاں بے زر انسان کے لیے یہی مقدر ہو کہ ظلم سہے اور داد نہ پائے، ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی دور کے ساتھ اس کی یہ یادگار بھی رخصت ہو جائے اور ہماری عدالتیں پھر سے اس اسلامی معیار پر قائم ہو جائیں جس کی رو سے انصاف رسانی ایک تجارتی کاروبار نہیں بلکہ ایک عبادت اور ایک خدمت بے زر ہے۔" (۳۶)

عدالتی طریقہ کار میں پیچیدگیاں

اس وقت ملک کے تمام ادارے سخت اضمحلال کا شکار ہیں لیکن جس ادارے کی اصلاح کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فکر کرنی چاہئے وہ عدلیہ کا ادارہ ہے۔ اگر حالات کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تو بڑے دکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج ملک میں عام آدمی کے لئے انصاف کا حصول سب سے مشکل بن گیا ہے۔ ملک پاکستان میں انصاف کی فراہمی پولیس کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ خاص طور پر فوجداری مقدمات میں پولیس کی اصلاح بنیادی حیثیت رکھتی ہے جب تک بنیاد درست نہیں ہوگی جو بھی عمارت بنائی جائے گی وہ ناپائیدار ہوگی۔ پولیس کی بدعنوانی اپنی جگہ لیکن عدلیہ کا ادارہ جس حد تک انصاف فراہم کرنے اور اپنے آپ کو مفادات، بااثر عنا

صرکے دباؤاور خود حکومت وقت کی دراندازیوں سے بالا رکھ کر اصلاح احوال کے لئے جو کردار ادا کر سکتا ہے وہ اس میں کامیاب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روز بروز عوام کا اعتماد پورے نظام عدل پر، نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ ترین سطح تک بری طرح مجروح ہوا ہے۔

مروجہ عدالتی نظام میں بہت پیچیدگیاں ہیں، معلوم نہیں یہ جان بوجھ کر رکھی گئی ہیں یا سہواًایسا ہوا، بہر حال جو بھی ہے اس قانونی سقم کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ قانون ضابطہ یعنی عدالتی طریقہ کار کی وجہ سے بعض اوقات غلط فیصلے منظر عام پر آتے ہیں اور ہدف تنقید قوانین اسلام ہوتے ہیں۔ پاکستان میں حدود آرڈیننس کے مؤثر نہ ہونے یا ان کے غلط استعمال کے بارے میں جو شکایات ہیں وہ کسی درجے میں جائز بھی ہیں لیکن ان کی ذمہ داری قوانین پر نہیں بلکہ سسٹم اور پروسیجر پر عائد ہوتی ہے لیکن ہم اس پر توجہ دینے کی بجائے حدود آرڈیننس کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں۔

عدالتی امور میں قومی زبان کی حوصلہ افزائی

انصاف رسانی کے نقطہ نظر سے یہ ضروری ہے کہ عوام اور اہل معاملہ خود قانون پڑھ اور سمجھ سکیں اور عدالتی کارروائی فریقین اور حاضرین سب سمجھ سکیں اور مطمئن ہوں کہ انصاف کا تقاضا پورا ہو رہا ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور عدالتی زبان لازماً اردو ہی ہونی چاہیے۔اس سلسلے میں ضروری ہے کہ تمام قوانین کے مستند اردو تراجم کرائے جائیں اور قوانین کے معیاری ایڈیشن حکومت کی نگرانی میں اور حکومت کی جانب سے شائع کیے جائیں اور آئندہ قانون سازی بھی اردو میں کی جائے۔اس مقصد کے لیے حکومت نے مقتدرہ قومی زبان کے نام سے ایک ادارہ اسلام آباد میں قائم کیا ہے جو کتب کے معیاری اردو تراجم فراہم کرنے میں کوشاں ہے، تاہم اس ادارے کی مزید سرپرستی اور سب سے بڑھ کر عملی اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔

مزید برآں یہ مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے قانون کے جو تراجم سامنے آئے ہیں وہ عام فہم نہیں ہیں۔اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ان تراجم کے مقابلے میں انگریزی قوانین نسبتاً عام فہم، سادہ اور آسان سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔ موجودہ نصاب تعلیم عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مشکل اور پیچیدہ عبارات سے حتی المقدور اجتناب کیا جانا چاہئے لیکن ہماری عدالتوں میں مستعمل اردو زبان انتہائی پیچیدہ الجھی ہوئی اور متروک ہے۔ مزید یہ کہ انگریزی سے اردو تراجم بھی انھی متروک الفاظ اور عبارات سے کیے گئے ہیں اصحاب الرائے کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔اب جبکہ قومی زبان اردو کو مؤثر صورت میں دفتری زبان بنانے سے متعلق عدالت عظمیٰ کا فیصلہ بھی آچکا ہے(۳۷) لہٰذا اب یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدالت

عظمیٰ کے فیصلے میں روشنی میں موثر تعلیمی پالیسی وضع کرے۔

التوا کی درخواستیں

انصاف کی فراہمی میں تاخیر کی وجہ سے عوام کا عدالتوں پر اعتماد کم ہوتا جارہا ہے اور اس تاخیر کی ایک اہم وجہ التوا کی درخواستیں ہیں۔ عدالتیں معمول کے مطابق التوادے دیتی ہیں اور فریقین بھی معمول کے مطابق التوا کی درخواستیں دے دیتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ التوا کی درخواستوں کا سختی سے جائزہ لیا جائے۔ کوئی معقول عذر ہو تو التوا دینا چاہیے ورنہ نہیں۔ وکلا صاحبان اور جج حضرات اگر چاہیں تو باہمی تعاون سے التوا روک سکتے ہیں۔

عدالتی سمن کی عدم تعمیل

سمن کی عدم تعمیل فصل خصومات میں تاخیر کا ایک بڑا سبب ہے۔ مدعی علیہ پر سمن کی تعمیل میں تاخیر فصل خصومات کی تاخیر پر منتج ہوتی ہے۔ موجودہ صورت حال کچھ یوں ہے کہ سمن کی عدم تعمیل کی صورت میں بیلف حکم نامہ سمن کی پشت پر اپنا حلفیہ بیان عدالت میں اپنی اس تصریح کے ساتھ پیش کر دیتا ہے کہ مدعا علیہ پر سمن کی تعمیل نہ ہو سکی یا مدعا علیہ لاپتا ہے یا تعمیل سمن سے انکاری ہے، جب کہ صورت حال کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کے بعد عدالت یک طرفہ کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ بیلف کا بیان محض رسمی ہوتا ہے اور یہ بیان دیتے ہوئے اسے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بیان حلفی کی تصدیق حاکم عدالت کے روبرو ہوا کرے، تاکہ بیلف کو اپنے بیان کی صداقت، اس کے شرعی تقاضوں اور ذمہ داریوں کی احساس بوقت حلف مستحضر رہے اور یہ محض رسمی ضابطے کی کارروائی بن کر نہ رہ جائے نیز یہ کہ مدعا علیہ اگر حاضر نہ ہو تو اس کی عدم موجودگی میں عموماً فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ عدالت میں اس کی حاضری کے لیے اشتہار جاری کرنے کے موجودہ طریق کار کو بدل کر عدالتوں کو جدید ذرائع بھی استعمال کرنا چاہییں۔ مثلاً ایس ایم ایس، ای میل اور مقامی ایف ایم ریڈیو کا استعمال۔

تزکیۃ الشہود اور گواہوں کا تحفظ

معاشرے میں عام طور پر مجرم ظالم، جابر، زبردست، مضبوط اور امیر ہوتا ہے جب کہ اس کا شکار ہونے والے افراد عموماً معصوم، کمزور، غریب اور دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور اس معاشرہ پر راج کرنے والے، ظالم، جابر، زبردست، مضبوط اور امیر ہوتے ہیں جب کہ کمزور افراد ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے جب کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو عینی شاہد یا تو روپوش ہو جاتے ہیں یا پھر کسی بھی قسم کی گواہی دینے سے مکمل طور

پر انکار کر دیتے ہیں کیونکہ دوسری صورت میں انہیں ظالم و جابر کے ظلم و جبر کو برداشت کرنا پڑ سکتا ہے یا پھر ان پر اور ان کے عزیز و اقارب پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے دوسری جانب مظلوم قابل رحم حالت میں ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی کا نام بطور گواہ لکھوائے تو اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ وہ عین وقت پر مکر جائے یا پھر دباؤ کے تحت مظلوم ہی کے خلاف گواہی دے اور اگر خوش قسمتی سے یہ مرحلہ بھی حل ہو جائے تو پھر اس کا واسطہ پولیس سے پڑتا ہے۔

صورتحال یہ ہے کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں اداروں میں قانون کی بجائے افراد کی حکمرانی ہے اور قانون کی منشاء کی بجائے افراد کی منشاء نافذ ہوتی ہے لہٰذا اس معاشرے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما ہے اگر اس معاشرے میں حدود کو ٹھیک طرح سے نافذ بھی کر دیا جائے تو صرف غریب اور کمزور کا ہی ہاتھ کٹے گا اور وہی سنگسار ہوگا۔ اگر کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو سب سے پہلے جس ادارے سے واسطہ پڑتا ہے وہ پولیس کا ادارہ ہے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ ڈاکو سے تو بچ سکتے ہیں مگر پولیس سے نہیں۔ پولیس بغیر رشوت کے کسی کی بات سننے پر گوارہ نہیں اور مجرم اگر امیر اور مضبوط ہے تو آپ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بلکہ الٹا خوار و بدنام ہوں گے کیونکہ ارتکاب جرم کے فوراً بعد مجرم ہی سیاسی اثر ورسوخ اور پیسے کا استعمال کرتے ہوئے پہلے سے رابطے میں ہوگا اور پولیس اندراج مقدمہ میں لیت و لعل کرے گی اس میں قانونی سقم پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔

تفتیش کا بنیادی مقصد شہادت اکھٹا کرنا ہوتا ہے اور آج کل کے جدید دور میں سائنسی بنیادوں اور حوالوں سے شہادت حاصل کرنا و ترتیب دینا نہایت اہمیت کا حامل ہے مگر یا تو پولیس جان بوجھ کر ملزم کو فائدہ دینے کی خاطر یا پھر صلاحیت کے فقدان کی وجہ سے اس سے یہ شہادت عموماً ضائع ہو جاتی ہے۔ مذکورہ حقائق اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم قوانین پر جتنی بحث کر لیں ان میں ترامیم اور ان کو اسلام کی روشنی میں اسلام کے مطابق بنانے کا جتنا بھی شور و واویلا کر لیں اور ان کو ٹھیک بھی کر لیں تو ان کو نافذ کرنے والے افراد ٹھیک نہیں ہوں گے تو ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ مذکورہ مراحل کے بعد پولیس زیر دفعہ ۱۷۳ ضابطۂ فوجداری چالان عدالت مجاز کو بھیجتی ہے اور اس دوران ملزم اگر حالات کو قابو میں رکھ کر مقدمہ میں کوئی خامی پیدا کرنے یا پانے پر جو کہ پولیس مدعی / مستغیث مقدمہ یا حالات کا شاخسانہ ہو سکتی ہے اپنی ضمانت کرانے کی کوشش کرتا ہے اور کسی خامی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ضمانت ہو جائے تو اس کے حوصلے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ مستغیث مقدمہ کی سبکی ہوتی ہے۔

ملزم کے خلاف اگر مقدمہ مضبوط ہو تو اس کا وکیل پیشی در پیشی کے تاخیری حربے استعمال کرتا رہتا

ہے جس سے عموماً مستغیث تنگ آ جاتا ہے اور اگر مقدمہ شہادت کی سطح پر ہو تو پھر پیشی پڑ جانے کا کئی گنا برا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ مستغیث مقدمہ گواہان کو کئی طرح کی منت سماجت کر کے عدالت لاتا ہے اور بعض اوقات گواہان بیرون شہر سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض اوقات حالات کی ستم ظریفی سے ایک ساتھ سماعت کیے جانے والے سیٹ کے گواہان مقررہ تاریخ پر پورے نہ ہو سکنا بھی تمام تر مستغیث کی مجبوریاں ہیں اور ان حالات سے تنگ آ کر مستغیث مقدمہ مخالف فریق کے دباؤ میں آ کر اکثر ان مقدمات میں بھی راضی نامہ کر لیتا ہے جن میں اس کو قانون اور شریعت اجازت نہیں دیتے کہ وہ راضی نامہ کرے، ان حالات میں عدالت کو چاہیے کہ وہ ضرورت کے تحت پیشی تو دے مگر مخالف فریق کو ہونے والے حرج اور گواہان کو ہونے والے حرج کا ازالہ بھی کرے۔ پاکستان کے معروضی حالات کے پیش نظر فوری اور بلا معاوضہ انصاف کی فراہمی اور شرعی سزاؤں کی تنفیذ کے لئے دیگر معاملات میں اصلاح کے ساتھ تزکیۃ الشہود کے عدالتی طریقہ کار کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔اس مقصد کے لئے نہ صرف گواہان مقدمہ کے تحفظ کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے بلکہ جھوٹے گواہان کو قرار واقعی سزا دینے کی بھی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) النور ۲:۲۴

(۲) اتاسی، محمد خالد، شرح مجلة الاحكام العدلية ،ص:۱۲۵

(۳) احمد الحجی،المدخل الفقهی،ص: ۶۵

(۴) ایضا،ص: ۸۶

(۵) ایضا

(۶) بنی اسرائیل ۱۷:۳۳

(۷) غازی، محمود احمد، محاضرات فقہ، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۴۱۴

(۸) ایضا،ص:۳۹۸

(۹) ایضا،ص:۳۹۹

(۱۰) الدارقطني ، أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد، سنن الدارقطني، كتاب الحدود والديات وغيره، مؤسسة الرسالة،

بیروت،لبنان،۱۴۲۴ھ - ۲۰۰۴م،رقم الحدیث۳۴۶۹

(۱۱) المائدہ۵:۴۴

(۱۲) الحاکم ،محمد بن عبداللہ، النیسابوري،مستدرک حاکم، دار الکتب العلمیۃ - بیروت،۱۴۱۱ - ۱۹۹۰،کتاب الادب،رقم۷۷۶۷

(۱۳) البقرہ۲:۱۷۹

(۱۴) بنی اسرائیل۱۷:۳۳

(۱۵) البقرہ۲:۱۷۸

(۱۶) النور۲۴:۱

(۱۷) النور۲۴:۲

(۱۸) النور۲۴:۲

(۱۹) الترمذی،ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ،جامع الترمذی،أبواب الحدود،باب ماجاء فی درءالحدود،رقم۱۴۲۴

(۲۰) البقرہ ۲:۱۹۰

(۲۱) البخاری،محمد بن اسماعیل،صحیح البخاری،دار ابن کثیر،الیمامہ،بیروت، ۱۹۸۷،کتاب الایمان ، باب الایمان وقول النبی، رقم۸

(۲۲) الغزالی،محمد بن محمد،احیاء العلوم(مترجم)،مکتبہ المدینہ باب المدینہ،کراچی،۲۰۱۲ء،ج۱،ص۱۷

(۲۳) ابن ماجہ،سنن ابن ماجة ، بَابُ فَضْلِ الْعُلَمَاءِ وَالْحَثِّ عَلَى طَلَبِ الْعِلْمِ،رقم الحدیث۲۲۹

(۲۴) الغزالی،احیاء العلوم،ج۱ص۱۷

(۲۵) النور۲۴:۱۹

(۲۶) الاحزاب۳۳: ۷۱-۷۰

(۲۷) الحدید۵۷:۲۵

(۲۸) مودودی،ابوالاعلیٰ،سید، تفہیم القرآن،ادارہ ترجمان القرآن،لاہور،۲۰۰۰ء،ج۵ص۳۲۲

(۲۹) الصف۶۱:۹

(۳۰) مسلم،صحیح مسلم ،کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف،رقم۴۴۱۰

(۳۱) ایضا،كِتَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلَاةَ،بَابُ كَرَاهِيَةِ تَأْخِيرِ الصَّلَاةِ عَنْ وَقْتِهَا الْمُخْتَارِ،حدیث۲۴۴

(۳۲) الموصلي،أبو يعلى أحمد بن علي بن المثنى مسند أبي يعلى،دار المأمون للتراث-دمشق ۱۴۰۴ – ۱۹۸۴، مسند عبد اللہ بن عمر، رقم الحدیث ۵۷۷۳،

(۳۳) الدار قطني ، أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد ،سنن الدارقطني،مؤسسة الرسالة، بيروت – لبنان ۱۴۲۴ھ - ۲۰۰۴م، كِتَابُ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ إِلَى أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ،رقم ۴۴۷۱،

(۳۴) ظفر احمد عثمانی،اعلاالسنن،كتاب الوكالة،باب الوكالة بالخصومة،دار الكتب العلمية،بيروت ۱۹۹۷ء،ج۱۵،ص۳۴۵

(35) Code Of Civil procedure Act V of 1908, order XLIV, rule 1

(۳۶) مودودی، ابو الاعلیٰ، سید، اسلامی قانون، ص:۷۰

(37) Constitution petition No:56 56 of 2003, Muhammad Kokab Iqbal versus Govt of Pakistan; Constitution petition No:112 of 2012,Mehmood Akhter Naqvi versus president of Pakistan.

☆☆☆☆☆☆☆☆